بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اشارات

موجودہ اشتعال انگیز ماحول میں جب کہ جماعت اسلامی کے مخالفین اس کی آواز کو دبانے اور اس کی راہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑے اوچھے ہتھیاروں اور گھٹیا ہتھکنڈوں کے استعمال پر اتر آئے ہیں، ہم اپنے رفقاء اور بہی خواہوں سے چند باتیں کہنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے جذبات کے اندر توازن پیدا کرسکیں اور اپنی صلاحیتوں کو بیکار کاموں میں ضائع کرنے کے بجائے تعمیری کاموں میں لگا سکیں۔

پہلی چیز جس کی طرف ہم انہیں بار بار توجہ دلا چکے ہیں اور اب پھر دلا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ مل کر وہ جو کام کر رہے ہیں وہ کوئی "سیاست بازی" نہیں بلکہ سراسر دین کی خدمت ہے۔ جماعت اسلامی اُن معنوں میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے جن معنوں میں آج لفظ "سیاست" بولا جاتا ہے۔ مادی تہذیب کی یلغار نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں سے شرافت، اخلاق، حق پرستی اور انصاف پسندی کو نیست و نابود کیا ہے وہاں اُس نے سیاست کا بھی حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی انسان کی توجہ کسی ایسے مذموم اور ناپاک دھندے کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جو صرف چالاکی، عیّاری اور مکر و فریب کے بل پر کیا جاتا ہے اور جس میں خلوص، ایمانداری، ایثار اور للّٰہیت نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ دورِ جدید کے سیاسی کاروبار کو دیکھتے ہوئے سیاست کی یہ تصویر کسی اعتبار سے بھی غلط نہیں۔ مادی تہذیب نے اجتماعی زندگی کی ساری غلاظتوں کو اس میدان میں لا کر جمع کر دیا ہے جن کی وجہ سے پوری فضا میں خوفناک قسم کا تعفن پھیل گیا ہے۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اخلاق و شرافت کے قدر دان نہ تو خود اس متعفن فضا کا رُخ کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی اس جسارت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ اِس فضا میں پہنچتے ہی اِس کے اخلاق کُش جراثیم آدمی کے اندر سرایت کرکے اس کے اخلاقی احساسات کو بالکل فنا کر دیں گے۔

---

یہ سیاسی کاروبار جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور جس سے آج ہر شخص واقف ہے اس سے جماعت کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ ہم اِس دھندے کو اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل غلط اور اخلاق سوز سمجھتے ہیں، اس سے محفوظ رہنے کے لیے خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ پوری انسانیت کو اس سے نجات حاصل ہو۔ جماعت اسلامی اوّل و آخر دینی جماعت ہے اور دین کے تقاضے کے تحت ہی وہ سیاسی میدان میں اُتری ہے۔ اس بنا پر اس کی سیاست سے دلچسپی اُسی حد تک ہے جس حد تک کہ اللہ کا دین مطالبہ کرتا ہے اور وہ فکر و احساس کے اُس مقدس سرمائے کے ساتھ اس میدان میں سرگرمِ عمل ہے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کا زادِ راہ ہوتا ہے۔ ہم جس طرح اس بات کے خواہش مند ہیں کہ انسان کے قلب و دماغ میں ایمان کی شمع فروزاں ہو، اس کی انفرادی زندگی اسلامی اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہو، اس کی معاشرت ہر بُرائی سے پاک ہو، اس کی معیشت ہر قسم کے ناجائز استحصال اور ہر ناانصافی سے محفوظ ہو، بالکل اسی طرح ہم اس بات کے بھی دل و جان سے متمنی ہیں کہ سیاست کے کاروبار سے جھوٹ، مکر و فریب اور ابن الوقتی کی ساری آلائشیں دُور کرکے اُسے خدا خوفی کی بنیاد پر از سرِ نو استوار کیا جائے اور اجتماعی زندگی کا یہ میدان چالاکیوں اور عیاریوں کا ناٹک پیش کرنے کے بجائے شرافت، پاسِ عہد، اصول پرستی اور ایثار کا نقشہ پیش کرے۔ لوگ اس میدان میں اُسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اتریں جس کے ساتھ وہ پانچوں وقت خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔

ہمارے رفقاء کو کسی مرحلے میں بھی عام "سیاست بازی" اور جماعت کی سیاسی جدوجہد کے مابین اس عظیم فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اس کام میں کوئی دنیوی فوائد حاصل کرنے یا حکومت پر

قبضہ کرکے اپنے لیے یا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے مختلف قسم کی جائز و ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہوئے۔ اِس میدان میں ہماری جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ قوت و طاقت کے اُس عظیم سرچشمے کو، جو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کرتا ہے، ہر قسم کی غلاظتوں اور آلائشوں سے پاک کیا جائے اور اس سے حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جائے۔

---

ظاہر بات ہے کہ جو افراد بھی ان غلاظتوں کو دُور کرنے اور تعفّن کی اس زہریلی فضا کو پاک کرنے کے لیے عملی طور پر آگے بڑھیں اُن کے لیے نہ صرف یہ بات ضروری ہے کہ وُہ ہر لمحہ اپنے مقصد کی عظمت کو سامنے رکھیں بلکہ اُن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وُہ اِس مسموم فضا کے ہلاکت خیز اثرات سے خود اپنے آپ کو بچانے کے لیے تمام مؤثر تدابیر اختیار کریں۔ اس سلسلے میں اُن کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ دینی اعتبار سے خود اچھی طرح صحت مند ہوں۔ کیونکہ اگر وہ خود ایمان و عمل کے لحاظ سے تندرست و توانا نہ ہوں گے تو وہ مسموم فضا میں پھیلے ہوئے جراثیم کے حملوں کا اچھی طرح مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ ہنگامی حالات میں عملاً یہ مشکل ہوتا ہے کہ جماعت اس کے لیے تربیت گاہیں قائم کرے۔ مگر انہیں خود اپنی تربیت کے فرض سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں وہ تمام تدابیر اختیار کرنی چاہییں جن سے اُن کے ایمان مضبوط اور اعمال صالح ہوں اور ان کے اندر اخلاص اور صبر و ثبات کی قوت پیدا ہو۔ قرآن و حدیث اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ انہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کی سیرتوں کا بھی مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔

---

دوسرے، اس مقدس جدوجہد کی خاطر میدانِ عمل میں اُترتے وقت انہیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ کسی عام دنیوی انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہیں بلکہ اس عظیم روحانی اور اخلاقی انقلاب کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جو انبیاء علیہم السلام جیسی عظیم اور مقدس ہستیوں کے

ہاتھوں برپا ہوا اور سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کے بعد جلیل القدر صلحائے امت جس کے لیے مسلسل تگ و دو کرتے رہے۔ میرے ایک نہایت ہی واجب الاحترام بزرگ، جو اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اپنی نیکی اور پرہیزگاری کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے، انہوں نے ایک مرتبہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بڑے بے ساختہ انداز میں یہ فقرہ کہا: "دنیا میں اس سے بڑا اعزاز اور اس سے بڑی خوش نصیبی کسی انسان کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے مشن کو دنیا میں سربلند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" مادہ پرستی کے اس دور میں جب انسانوں کی عظیم اکثریت زندگی کے ہر معاملے کو مادی سود و زیاں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہے، اگر کچھ لوگ اُخروی فلاح و کامرانی کو زندگی کا اصل مقصود و مطلوب قرار دے کر جدوجہد کریں تو یہ اس گروہ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے جس کے لیے اس کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اس وقت جب کہ لوگوں کو دنیوی لذتوں نے بالکل مدہوش کر دیا ہے وہ اس گروہ کو اپنا حریف سمجھ کر اُسے بالکل مٹانے پر تلے ہوتے ہیں، مگر انہیں اپنے اس فیصلے کی غلطی کا جلد ہی احساس ہو جائے گا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انسانیت کی اخلاقی صحت کے لیے اس گروہ کا وجود کتنی بڑی نعمت ہے۔

---

جو شخص جسمانی اعتبار سے علیل ہو وہ خود طبیب کے پاس چل کر آتا ہے اور اس سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ مگر جو لوگ روحانی اور اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اُن کی فکر اس قدر مفلوج ہو جاتی ہے کہ وہ خود اپنے دشمن بن کر اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے حقیقی بہی خواہوں کو اپنا بدخواہ اور اپنے بدخواہوں کو اپنے بہی خواہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ غور کیجیے کہ وہ لوگ کس قدر بے نفس، صابر اور معتدل مزاج ہوں گے جو ان روحانی اور اخلاقی مریضوں کی صحت کے لیے سرگرمِ عمل ہوں۔ یہ معالج اس انتظار میں نہیں رہتے کہ مریض اُن کی طرف رجوع کریں اور پھر وہ اُن کی صحت کی بحالی کے لیے کوشش کریں، بلکہ یہ بڑی دل سوزی کے ساتھ مریضوں کی طرف لپکتے ہیں اور اُن کی ساری نادانیوں کے باوجود اُن کے اندر سوئی ہوئی شرافت اور خدا خوفی کو بیدار کر کے

انہیں روحانی اعتبار سے صحت مند بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ان روحانی اور اخلاقی عوارض میں مبتلا ہے اور ان کے خطرناک نتائج بھی اس کے سامنے کھل کر آگئے ہیں۔ مگر مادہ پرستی کے اس روگ نے اس کے اندر شعور کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اُسے اس امر کا قطعاً احساس نہیں ہو رہا کہ وہ کس قدر سرعت کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ ان حالات میں انسانوں کا جو گروہ بھی ان عوارض کو دُور کرنے کے لیے جد و جہد کرے گا اُسے ناقابلِ بیان مشکلات سے سابقہ پیش آئیگا۔

---

ہمارے بعض رفقاء ان مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ مگر انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ساری مشکلات اس راہ کی فطری دشواریاں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی انہونی نہیں۔ قادرِ مطلق ہم جیسے کم مایہ اور بے بضاعت اور کمزور عزم و ارادے والے آدمیوں کو اپنی پناہ میں رکھے، مگر تاریخ کے مطالعے سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ بگڑے ہوتے معاشرے کی اخلاقی اور روحانی اصلاح یا دوسرے لفظوں میں انسانوں کو حیوانیت کی پست سطح سے اٹھا کر انسانیت کی اصلی سطح پر لے آنا دنیا کا سب سے مشکل، سب سے زیادہ صبر آزما اور سب سے زیادہ محنت طلب کام ہے۔ اس راہ میں انسانیت کے بہی خواہوں نے گالیاں کھائیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، گھر بار لٹایا اور بعض حالات میں بڑی اذیت کے ساتھ جانیں بھی قربان کیں۔ جو فرد یا گروہ انسانیت کے حقیقی مقام کو کھو دیتا ہے اس کے لیے پھر کوئی بُرائی بُرائی نہیں رہتی۔ وہ انسانیت کے اصلی بہی خواہوں کو ہر طرح سے ستاتا اور پریشان کرتا ہے۔ جو شخص حق و صداقت کی راہ چھوڑ کر اپنی ہی دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ہے اس سے کسی دوسرے شخص کی عزت و آبرو اور جان و مال کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ اس وقت جماعت اسلامی کے خلاف جس قسم کی الزام تراشیاں اور دست درازیاں ہو رہی ہیں وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے کا بالکل فطری ردِ عمل ہے جس پر ہمیں کبھی برافروختہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ جو اشخاص ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں ان کے حق

میں بھی اسی اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ دُعا کرنی چاہیے جو ہمیں حضور سرورِ کائنات دو عالم کی اس دُعا میں ملتی ہے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو معاف فرمائے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر مغفرت کے بجائے قادرِ مطلق سے قوم کے لیے ہدایت کی استدعا کی گئی ہے۔

قاضی عیاض نے اپنی کتاب الشفاء میں اس دُعا کے کئی ایک مضمرات بیان کیے ہیں۔ یہ دعا حضور سرورِ کائنات ؐ کی نوعِ انسانی سے غایت درجہ محبت اور گم کردہ راہ لوگوں کے لیے ہدایت کی گہری آرزو اور تمنا کی آئینہ دار ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حلم اور صبر کے مقدس جذبات جھلکتے ہیں اور اپنے مخالفین کے خلاف کینہ، بغض اور عداوت کی جگہ بے مثال رحم اور شفقت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اور پھر انہیں اللہ کے غضب سے بچانے کے لیے خود اُن کی طرف سے یہ عذر بھی بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ لوگ حقیقتِ حال سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسی ناپسندیدہ حرکات کر رہے ہیں، اس لیے انہیں معاف کر دیا جائے۔

---

عفو و درگزر، صبر و تحمل اور بُردباری جیسی اعلیٰ صفات جس تناسب سے ہم اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اسی نسبت سے ہم دنیا میں فائزالمرام اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہمارے خلاف جھوٹ کا طوفان اٹھایا جاتا ہے اور طرح طرح کی غلط باتیں ہماری طرف منسوب کر کے ہمیں رُسوا و بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ہمارے اندر جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مگر ہمیں ان بے ہودگیوں پر صبر کر کے اجر کی امید رکھنی چاہیے اور اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ قدرت کا یہ نظام یونہی کسی اندھی قوت کے اشارے پر نہیں چل رہا ہے بلکہ اسے ایک ایسی بصیر و خبیر اور عادل و صاحبِ اختیار ہستی چلا رہی ہے جو نہ صرف ہر قسم کی زیادتیوں کو اچھی طرح

جانتی ہے بلکہ انصاف کرنے اور ظالم کو سزا دینے کی بھی پوری پوری قوت رکھتی ہے۔

ہم اپنے رفقاء کو اس مرحلے پر قرآن مجید کی یہ آیت پیش نگاہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ... (طٰہٰ، ۱۳۰)

صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

---

صبر کے لغوی معنی رہ کنے اور سہنے کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے۔ صبر کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اشتعال انگیز حالات میں قوت و طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بے قابو نہ ہونے دینا صبر ہے۔ مخالفین کی زیادتیوں اور اتہام تراشیوں کو سکونِ خاطر کے ساتھ نظر انداز کر دینا صبر ہے۔ قرآنِ مجید نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۔ (مزمل-۱۰)

ان کی باتوں پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔

صبر راہِ خدا میں جدوجہد کے لیے ایک لازمی صفت ہے۔ دنیا میں آج تک بھلائی کی اشاعت اور اس کے نفاذ کو کبھی بھی دنیوی مفاد کے پرستاروں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ بگاڑ کے علمبرداروں نے اس کی ہمیشہ پوری شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے اور جو لوگ اس راہ میں نکلے ہیں اُن پر ہر قسم کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہلِ خیر صبر کا دامن چھوڑ دیں تو وہ اپنے مقدس مشن کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ، اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ

جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لے اس پر کوئی گرفت نہیں۔ گرفت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں۔

الْحَقِّ ۚ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (شوریٰ ۴۲: ۴۳)

ایسے ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

---

اللہ کے دین کی سربلندی کا کام کوئی پھولوں کی سیج نہیں جسے کوئی فرد یا گروہ کوئی تکلیف اُٹھائے بغیر سرانجام دے سکے۔ جب کوئی شخص نیکی کا حکم دیتا ہے تو منکرات کے سارے ایوانوں میں دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب مل کر حق کے خلاف یلغار کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص بُرائی سے روکتا ہے تو برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اسے اپنے خلاف ایک خوفناک چیلنج سمجھ کر اس کے مقابلے میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے وقت مختلف قسم کے مصائب کا پیش آنا بالکل فطری امر ہے اور انہیں ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرنا بھی دینِ حق کا ایک تقاضا ہے۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

نیکی کا حکم کر اور بُرائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس پر صبر کر، یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔

---

قرآن مجید نے راہِ خدا میں نکلنے والوں کے لیے اخلاص، توجہ الی اللہ، صبر و ثبات کی جو بار بار تلقین کی ہے اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس کی دوسری وجہ انسانی فطرت کی ایک بہت بڑی کمزوری کے بارے میں احساس دلانا ہے۔ انسان جب کوئی جدوجہد کرتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ اس کے ثمرات کو وہ جلد ہی اپنی جھولی میں ڈال لے۔ مگر جب اسے اس صبر آزما اور مشکل کام میں بظاہر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ بسا اوقات کسی سستے نسخے کو آزما کر کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ بے صبری اس سے ایسے غلط کام کروا ڈالتی ہے جو اصل مقصد کے منافی بھی ہوتے ہیں اور اس کے لیے نقصان دہ بھی۔ قرآن مجید نے اسی لیے صبر کی تلقین کے ساتھ جلد بازی سے روکا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ (احقاف: ۳۵)

پس صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور مخالفوں کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔

---

مقصد اور ذرائع کے باہمی تعلق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقدس مقاصد مقدس ذرائع کی مدد ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مقصد تو نیک ہو مگر حاصل اُسے ناپاک ذرائع سے کیا جاتے۔ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد للہیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ذرائع ناپاک ہوں تو ممکن ہے کہ انسان دنیوی اعتبار سے بظاہر کامیاب ہوتا نظر آتے، مگر دینی اعتبار سے ناکام ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی کامیابی کا دارومدار ظاہری کامیابی پر نہیں بلکہ خلوص نیت، راست بازی اور اللہ کی رضا پر ہے۔ اگر اس نے کامیابی کی بے جا خواہش اور تمنا میں اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دیا تو وہ کامیاب ہونے کے باوجود ناکام و نامراد رہا۔ لیکن اگر اُس نے اس جدوجہد میں حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑا اور مشکلات و مصائب کے باوجود جادۂ مستقیم پر گامزن رہا تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہی ہے، چاہے ظاہر بیں آنکھوں کی نظر میں وہ ناکام ہو۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف مختلف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ حٰم السجدہ میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۳۳)

اور اس سے زیادہ اچھی بات اور کس کی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور خود نیک کرداری اختیار کی اور کہا کہ مَیں اللہ کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

یعنی سب سے اچھی بات اُس بندۂ خدا کی ہے جو ایمان و عمل کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے

دوسرے بندوں کو بھی اُس کی طرف بلاتا ہے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور اس راہ میں جان کھپاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اسی بات کی متقاضی ہے کہ داعی کے اپنے اعمال نیک ہوں اور وہ خود اپنے مالک و خالق کا فرماں بردار بندہ ہو کیونکہ اگر اس کی اپنی زندگی اطاعتِ الٰہی سے مزین نہ ہوگی تو اس کی دعوت الی الخیر میں کیا اثر ہوگا؟

---

مقصد کی پاکی کے ساتھ ذرائع کی پاکی اسلام کا ایک ایسا تابناک اور امتیازی پہلو ہے جو ایک مسلمان کی جدوجہد کو اوّل سے لے کر آخر تک روحانیت کے نُور سے منور کر دیتا ہے۔ یورپ کے حکما نے اہلِ یورپ کو جو فلسفۂ اخلاق دیا ہے اُس کی رُو سے مقصد اور ذریعہ کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ انہیں مادّی فلسفۂ حیات نے یہ تعلیم دی ہے کہ اصل چیز مقصد کا حصول ہے اور اسے جائز و ناجائز جس طریقے سے بھی حاصل کیا جا سکے، حاصل کر لینا چاہیے۔ اس فلسفے کو پُوری قوت کے ساتھ یورپ کے بہت سے مفکرین نے پیش کیا ہے، جن میں میکیاولی سرِفہرست ہے۔ اس شخص نے اس باطل فلسفہ کا پرچار کر کے یورپ کے اخلاق کو جس طرح بگاڑا ہے اس کا پُوری طرح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اسی باطل پرست "فلارنسا دی حکیم" کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ حیلہ بازی، موقع پرستی، مکر و فریب سب کو سندِ جواز مل گئی ہے، جھوٹ اور سچ کو ایک ہی مقام پر لا کھڑا کر دیا گیا ہے اور اس فلسفے کی وجہ سے سیاست کے اندر غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی حرکات کا عام چلن ہوا ہے۔

---

اسلام کا اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ کوئی مقصد جس ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وہ ذریعہ خود اس مقصد کا ایک حصّہ ہے۔ اسلام نے اپنی مقدس منزل تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اور انداز تجویز کیا ہے وُہ خود بھی اتنا ہی مقدس اور پاکیزہ ہے جتنی کہ خود منزل۔ کیونکہ اسلام کے پیشِ نظر یہ بنیادی حقیقت بھی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ جس راہ سے، فکر و احساس کے جس جذبے اور جس حوصلے اور نیّت اور عزم کے ساتھ کسی منزل کی طرف بڑھتا ہے، اُن سب کا منزل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسلام اس بات کو

اصولاً غلط اور فطرت کے منافی سمجھتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ غیر اخلاقی حرکات کی مدد سے کوئی بلند اخلاقی اور روحانی نصب العین حاصل کر سکے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کی صراحت فرمائی ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (رعد: ۲۲)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی خاطر صبر کیا اور نماز قائم کی اور جو رزق ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور جو برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔

یہ آیت مقصد اور ذریعہ کے باہمی تعلق اور ان دونوں کی تقدیس پر نہایت واضح الفاظ میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے خدا کے مخلص بندے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور اس راہ میں ثابت قدم رہ کر جدوجہد کرتا ہے اور جو مصائب اُسے پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ اس مقدس جدوجہد کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کے لیے سب سے اہم فرض نماز ہے۔ نماز کے ذریعے ہی اپنے رب کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے دل سے حرص، لالچ، بخل اور دنیوی مال و متاع کی محبت نکال کر اس کے اندر اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اس عمل سے اُسے راہِ خدا میں خلوص نیت کے ساتھ ایثار کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ اور اسی ضمن میں آخری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ایک مومنِ صادق بُرائی کو نیکی سے دفع کرتا ہے۔ برائی کا مٹانا ایک بھلائی کا کام ہے۔ خدا کا بندہ اس بھلائی کے کام کو بھلائی ہی سے سرانجام دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس بھلائی کے کام کو بُرائی کے ساتھ سرانجام دے تو اس کے مقدس مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کا آخری جملہ "ان کے لیے آخرت کا انجام ہے" بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں خواہ مومن کو کامیابی نصیب نہ ہو مگر آخرت کی کامیابی جو درحقیقت اس کی جدوجہد کی غایتِ اولیٰ ہے وہ اُسے ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک مومن کا مطلوب و مقصود جب رضائے الٰہی ہے جو سچے اور گہرے ایمان و ایقان اور پاکیزہ اعمال ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، تو خدا کا مخلص بندہ اس کے حصول کے لیے آخر ناپسندیدہ ذرائع کے استعمال کے بارے میں کس طرح سوچ سکتا ہے؟

---

ایک مسلمان کے لیے سیاسی جدوجہد، معاشی تگ و دو، معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش اور علم کے حصول کے لیے محنت، کوئی ایک کام بھی منتہائے مقصود نہیں بلکہ یہ سارے کام رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس بنا پر ان سارے کاموں کو اسی احساسِ ذمہ داری اور خلوصِ نیت سے ادا کرنا چاہیے جس طرح کہ ایک انسان دینی فریضے کو ادا کرتا ہے۔ سیاسی جدوجہد سے اس کا مقصد اپنی قوم یا اپنے ملک یا اپنے قبیلے یا خود اپنی ذات کی سربلندی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے پیچھے اللہ کے دین کو دنیا میں سربلند اور غالب کرنے کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ اسی طرح معاشی تگ و دو سے اس کا مقصود اپنی ذات یا برادری کے لیے زیادہ سے زیادہ معاشی منافع سمیٹنے کے بجائے انہیں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سچی اور گہری آرزو ہونی چاہیے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں یوں فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ | کہہ دو کہ میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔ |
| (الانعام: ۱۶۲) | |

یہ ہے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ایک مومن کی زندگی کا مقصد اور اس کا صحیح طرزِ عمل۔ اس کی عبادت اور مذہبی اعمال، اس کی زندگی اور اس کی موت سب کا منتہائے مقصود خدا کی خوشنودی ہونی چاہیے۔ اس بنا پر وہ سارے ذرائع جن کی مدد سے ایک مسلمان اس مقصود کو حاصل کرتا ہے وہ بھی بندگیٔ رب میں شامل ہیں۔

---

مغرب میں مقصد اور ذریعہ کو الگ الگ سمجھنے کا جو غلط تصوّر رائج ہے اس کی بنیاد دین و دنیا کی وہ تفریق ہے جس کی ابتدا کلیسا نے کی اور جسے بعد میں مغرب کے مادہ پرست مفکرین نے قوت بہم پہنچائی۔ مگر یہ مفکرین اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ جس نصب العین کو مقدس سمجھا جاتا ہے وہ خود دوسرے بہت سے مقاصد سے عبارت ہوتا ہے جس میں ذرائع بھی شامل ہوتے ہیں۔ فکری اور نظری اعتبار سے ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق کی جاسکے مگر عملی جدوجہد میں مقصد اور ذریعہ کے درمیان امتیاز نہیں کیا جاسکتا اور جو لوگ اس طرح کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے لیے بہت سی اُلجھنیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کے لیے یوں تو کئی ایک مثالیں دی جاسکتی ہیں، مگر مَیں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اسلام کے نظامِ عبادات پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پانچوں فرائض ذرائع اور مقاصد دونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ہم زندگی کا اصل مقصود رضائے الٰہی کو قرار دیتے ہیں تو یہ مذہبی فریضے اُسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مگر جب فرائض کی ادائیگی کو مقصدِ حیات ٹھیراتے ہیں تو جن وسائل سے ہم یہ فرائض سرانجام دیتے ہیں ان کی حیثیت ذرائع کی بن جاتی ہے۔ مثلاً حج رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ بھی ہے، مگر یہی فریضہ جب مقصد بنتا ہے تو مال و دولت ذریعہ بن جاتی ہے جس کی مدد سے اس فرض کو سرانجام دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سیاسی جدوجہد کی مختلف کڑیاں ایک نقطۂ نظر سے مقاصد اور دوسرے نقطۂ نظر سے ذرائع کی حیثیت اختیار کرسکتی ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو سیاست کی حیثیت ذریعہ کی سی ہوتی ہے کیونکہ سیاسی قوت اس عظیم مقصد کی تکمیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ مگر دوسرے نقطۂ نگاہ سے جب اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے سیاسی جدوجہد کی جاتی ہے تو یہ فرض بذاتِ خود مقصد دکھائی دینے لگتا ہے اور انتخابات میں کامیابی کے لیے سعی و جہد، رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے تگ و دو، یہ سب کام ذرائع کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اسی بنیادی حقیقت کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے بعض لوگ جماعت

اسلامی کی سیاسی جدوجہد اور اس کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے، اور اسے ایک سیاسی جماعت کہہ کر اس کے دینی مرتبہ و مقام کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام نے جب مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھی تو ہم آخر یہ جسارت کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ جن کاموں کو دنیا غیر مذہبی کام سمجھتی ہے ان کو اس نے مذہب کے تابع کر کے اور انہیں اخلاقی حدود کا پابند بنا کر اور ان کے اندر روحانیت کا نور بھر کر حیاتِ انسانی کو ایک فطری وحدت عطا کی ہے۔ یہ وحدت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر گام اور ہر قدم پر دینی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کیا جاتے۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (الحج ۳۴) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے لہذا اسی کے تم فرمانبردار بنو۔

---

گذشتہ صفحات میں ہم نے جماعت کے رفقاء کو جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے ان کا زیادہ تر تعلق قلب و دماغ سے ہے۔ یہاں ہم چند باتیں عملی جدوجہد کے سلسلے میں بھی ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز تدبر ہے یعنی انہیں ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ ان کی جدوجہد زیادہ سے زیادہ بہتر نتائج پیدا کر سکے اور ان کی محنت کا کسی طور بھی ضیاع نہ ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ معاشرے کے اجزائے ترکیبی اور اس کے مختلف طبقات کے احساسات و رجحانات سے پوری طرح واقف ہوں تاکہ ہر طبقے تک اپنی دعوت بڑی کامیابی کے ساتھ پہنچا سکیں۔ معاشرے کے جو نفسیاتی تجزیے کیے گئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ایک انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عموماً ایک معاشرے میں پانچ فیصد ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو حق و صداقت کی آواز سنتے ہی اس پر دل و جان سے لبیک کہتے ہیں اور پھر اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ ۵ فیصد طبقہ ٹیڑھے دماغ کا مالک ہوتا ہے اور کوئی صحیح بات اس کے دماغ میں اترتی ہی

نہیں سکتی ۔ یہ طبقہ ہر صحیح چیز کی مخالفت کرتا ہے۔ معاشرے کے باقی نوے فیصد افراد پر "خاموش اکثریت" (SILENT MAJORITY) کا اطلاق ہوتا ہے جس کی حیثیت خاموش تماشائی کی سی ہوتی ہے ۔ اگر حق وصداقت منظم ہو کر قوت حاصل کرلے تو یہ طبقہ اس کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے اور اگر باطل غالب قوت بن جائے تو یہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگ جاتا ہے ۔

---

پھر اس "خاموش اکثریت" میں بھی کئی طبقے پائے جاتے ہیں مگر بہت بڑا طبقہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں دنیوی مفادات سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ دراصل دنیوی مال و متاع کی پرستش کرتے ہیں اور جس طرف انہیں یہ زیادہ مقدار میں حاصل ہوتا نظر آئے اس کی طرف جھک جاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض افراد بڑے شدومد کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی اخلاقی اقدار سے یکسر عاری ہوتی ہے ۔ تاہم اس خاموش اکثریت میں ایک معقول تعداد ان افراد کی بھی پائی جاتی ہے جو محض غلط فہمی کی بنا پر حق وصداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور اگر صحیح بات ان کی سمجھ میں آجائے تو پھر وہ نہ صرف مخالفت سے باز آجاتے ہیں بلکہ حق کے علمبرداروں کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں ۔

---

ہمارے رفقاء کو دعوتِ دین کے معاملے میں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی بات زیادہ مؤثر انداز میں معاشرے کے اُس پانچ فیصد طبقہ تک پہنچائیں جو حق وصداقت کی حمایت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور جب بھی کسی طرف سے کوئی بھلائی کی آواز بلند ہو تو آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتا ہے ۔ اس ذیل میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر ہم اس طبقے کو کس طرح پہچانیں ؟ اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے ۔ چند صفات ایسی ہیں جن سے یہ طبقہ بڑی آسانی کے ساتھ پہچانا جاسکتا ہے ۔

(۱) اس طبقے کے افراد کو دنیوی مال و متاع سے کوئی زیادہ محبت نہیں ہوتی اور وہ اصولوں کی خاطر اپنے مفاد کو بڑی آسانی کے ساتھ قربان کرسکتا ہے ۔ اسے مال و اسباب اور (باقی ص ۶۲ پر)

# (بقیہ اشارات)

دنیوی عزت وجاہ سے کہیں زیادہ اصول عزیز ہوتے ہیں۔

(ب) جب اس طبقے کے لوگ کسی بات کے قائل ہو جاتے ہیں تو پھر وہ عملی جدوجہد سے گریز نہیں کرتے بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے پوری قوت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں اور اس راہ کی ساری مشکلات اور موانع کو بڑے صبر و ثبات سے برداشت کرتے ہیں۔

(ج) اس طبقہ کی تیسری بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے افراد کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے ان کی گفتگو اور کسی مسئلہ کے بارے میں ان کے اندازِ استفسار سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر حق کو سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے کی طلبِ صادق موجود ہے اور وہ اپنے ذہنوں کو اس معاملے میں یکسو کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود اپنے ذہن میں الجھنیں پیدا نہیں کرتے بلکہ جو الجھنیں فی الحقیقت موجود ہوں انہیں خلوصِ نیت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو طنز و تعریض سے یکسر پاک ہوتی ہے

(د) یہ افراد صرف اسی وقت تک رکے رہتے ہیں جب تک انہیں ایک بات کے حق ہونے کا اطمینان نہیں ہو جاتا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد ان کا طرزِ عمل یکسر بدل جاتا ہے اور حق و باطل کے معاملہ میں تماشائی کا کردار ادا کرنے سے ان کی فطرت انکار کر دیتی ہے۔

(ہ) پھر سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی یہ لوگ بڑے پختہ ہوتے ہیں اور اپنی مضبوط سیرت کی وجہ سے معاشرے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خیانت، نفاق اور مکر و فریب سے ان کی زندگیاں بالعموم پاک ہوتی ہیں اور ان کے طرزِ عمل کو دیکھنے سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی اعلیٰ و ارفع نصب العین کی محبت سینے میں لے کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

مندرجۂ بالا صفات سے متصف افراد کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔ ان کی جس قدر زیادہ تعداد کسی جماعت کو میسر آسکے گی یا کسی نصب العین کی علمبردار ہو گی اسی نسبت سے اس جماعت کو قوت فراہم کرے گی اور وہ نصب العین دنیا میں سربلند ہو گا۔ لہٰذا ہمارے رفقاء کو ان صفات کے حامل افراد کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

---

اس حق پسند طبقے کے مقابلے میں جماعت کے بہی خواہوں کو اپنی قوتیں اُس طبقے پر کم از کم خرچ کرنی چاہییں جسے دنیا پرستی، حسد، نفاق اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی عوارض نے بالکل ناکارہ کر دیا ہے۔ اس طبقے کی بھی بعض مخصوص نشانیاں ہیں جن سے وہ پہچانا جا سکتا ہے۔

(ا) اس طبقے کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کے افراد صحیح بات معلوم کرنے کے بجائے غلط باتیں ڈھونڈھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور اگر غلط بات نہ ملے تو صحیح کو غلط بنانے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ اگر ان سے گفتگو کی جائے تو چند لمحوں میں یہ راز کھل جاتا ہے کہ یہ جھگڑالو لوگ ہیں۔ کوئی مسئلہ سمجھنا نہیں چاہتے بلکہ اُلجھنا اور اُلجھانا چاہتے ہیں۔ جھوٹ، الزام تراشی اور افترا پردازی ان کا دل پسند مشغلہ ہوتا ہے اور یہ اپنے مخالفین کو ہر طرح سے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب) ان کا ذہن بڑا تخریب پسندانہ ہوتا ہے۔ یہ ہر اچھے کام کو بگاڑنے کے درپے رہتے ہیں مگر خود کوئی بھلائی کا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ کسی معاشرے میں جہاں بھی کوئی اچھا کام ہو یہ اس میں ایک دوسرے سے بڑھ کر کیڑے نکالتے ہیں، اور خوردبین لگا لگا کر دوسرے کے عیب تلاش کرتے ہیں اور پھر انہیں بڑے زور و شور سے اچھالتے ہیں، اور اس طرح بھلائی کے کام کرنے والوں کو خوب رُسوا اور بدنام کرتے ہیں، مگر خود کوئی تعمیری کام کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ان کا طرزِ فکر بڑا ہی دل شکن، طرزِ استدلال بڑا بھونڈا اور گفتگو کا انداز بڑا عامیانہ اور سُوقیانہ ہوتا ہے۔ پھر یہ احساسِ تناسب کے اس حسن سے بھی عاری ہوتے ہیں جس سے زندگی میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مخالف کی ہر اچھی سے اچھی بات کے اندر ہزار نقائص پیدا کرتے ہیں اور اپنے ہم خیال لوگوں کے معائب پر نہ صرف پردہ ڈالتے ہیں بلکہ انہیں محاسن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انہیں حق و صداقت سے محبت نہیں ہوتی بلکہ اپنے جتھے سے وابستگی ہوتی ہے اور بالکل اندھے ہو کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی ساری زندگیاں شرفا کو ستانے اور ان کی پگڑیاں اچھالنے میں گزر جاتی ہیں۔

جن لوگوں کے اندر یہ کمالات پائے جائیں ان کے لیے خدا سے دُعا تو کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے مگر کسی تعمیری کام کرنے والے آدمی کو اپنا قیمتی وقت ان کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جو وقت بھی خلوصِ نیت کے ساتھ راہِ خدا میں خرچ کرے گا وہ خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہوگا، لیکن اگر یہی وقت کسی اچھے

اور بھلے آدمی کو سمجھانے میں صرف کیا جائے تو اس سے انشاء اللہ بہتر نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔

---

جہاں تک "خاموش اکثریت" کا تعلق ہے اس کے سامنے حق بات کو ایسی حکمت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے کہ وہ اس اکثریت کے ان سب لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لے جو خیر پسند ہوں۔ کوئی معاشرہ جب تک بگاڑ کی انتہا کو نہ پہنچ جائے، اس کے عوام میں اکثریت دانستہ شر پسند نہیں ہوتی، بلکہ اس کی ہمدردیاں آخر کار انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں جو اسے واقعی بھلائی کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر معاشرے میں بھلائی ایک تحریک کی صورت میں کام کر رہی ہو تو عوام کا بڑا حصہ رفتہ رفتہ اس کا حامی و مددگار بنتا چلا جاتا ہے اور اس میں سے کام کے لوگ نکلتے چلے آتے ہیں۔ ممکن ہے ابتدائی مراحل میں یہ لوگ زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے مددگار ثابت نہ ہو سکیں لیکن جوں جوں انہیں اپنے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے گی اسی نسبت سے ان کے اندر عزم اور ارادے کی پختگی اور کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گا جو انہیں جلد ہی تحریک کا سرگرم حامی اور بہتوں کو فعال کارکن بنا دیگا۔

---

اس کے بعد خاموش اکثریت کا وہ عنصر باقی رہ جاتا ہے جس کے افراد دنیوی مال و متاع اور عزّ وجاہ کے پجاری ہوتے ہیں اور اس بنا پر ہر چڑھنے والے سورج کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی وفاداریاں مفادات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ جس گروہ یا جماعت سے ان کے مفادات وابستہ ہونگے یہ بہر طور اسی کا ساتھ دیں گے۔ ان کے اندر دین، ایمان، ضمیر، اخلاق جیسی پاکیزہ چیز نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ ان بے ضمیر لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے اور اپنے ساتھ لگانے کا آخر کیا فائدہ؟ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ نہ ان کو ہم اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں، نہ ان کو کھینچ کر ہم کوئی فلاح پا سکتے ہیں۔

---

## ضروری گذارش

خریدارانِ ترجمان القرآن کی اطلاع کے لیے گذارش ہے کہ یکم جون ۱۹۷۰ء سے بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں حسبِ ذیل اضافہ کیا گیا ہے:

چندہ سالانہ آٹھ روپے - قیمت فی پرچہ ۸۰ پیسے۔

مشرقی پاکستان (ہوائی ڈاک سے) " " ۹۰ پیسے۔ سالانہ ۱۰/- روپے۔ (مینجر)